وحدانیت خدا

حقیقت امر:

ہر واقعہ اور حقیقت امر کو دنیاوی حقائق میں اگر ہم فرض کریں تو حقیقت امر ہے محدود یعنی فرض یا مفروضہ (سبب وشرط کے وجود کا فرض) کے لحاظ سے وہ وجود کا مالک ہے اور دوسرے مفروضے کی بنیاد پر (عدم سبب وشرائط کا فرض) نتیجہ منفی ہے۔

حقیقت میں وجود کی ایک حد معین ہے جس حد سے باہر وجود نظر نہیں آ سکتا لیکن صرف خدا وحدہ لاشریک کی ذات ہے جس کے وجود کے لئے کسی حد یا سرحد کو فرض نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اس کی واقعیت مطلق ہے وہ بہر صورت ہر جگہ موجود ہے کسی بھی علت وسبب اور شرط کی احتیاج نہیں رکھتا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ لامحدود امور میں اور لامتناہی موارد میں عدد کو فرض نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ ہر وہ دوسرا جو فرض کیا جائے گا وہ پہلے سے بہتر ہوگا نتیجتاً دونوں محدود اور متناہی ہوں گے اور حقیقت میں ایک دوسرے کو محدود کردیں گے مثلاً اگر ہم کوئی لامحدود اور لامتناہی حجم فرض کرلیں تو اس کے مقابل میں دوسرے حجم کو فرض نہیں کیا جاسکتا اور اگر ہم فرض بھی کرلیں تو دوسرا وہی پہلا ہوگا لہٰذا خدا وحدہ لاشریک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

ذات وصفت:

مثال کے طور پر اگر انسان کو عقلی غور وفکر کا عنوان قرار دیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ انسان ایک ذات رکھتا ہے وہ اس کی انفرادیت انسانیت کا جوہر ہے نیز اسکے علاوہ اس میں چند

صفات بھی ہوتی ہیں جن سے اس کی ذات متعارف ہوتی ہے جیسے یہ کہ وہ فلاں شخص کا باپ ہے یا فلاں شخص کا بیٹا ہے، عقلمند ہے توانا ہے بلند قامت ہے خوبصورت ہے وغیرہ وغیرہ یا پھر وہ اس کے برخلاف اوصاف رکھتا ہے۔

یہ صفات اگرچہ ان میں سے اکثر اوصاف جیسے پہلی اور دوسری صفت ہرگز انسان کی ذات سے جدا نہیں ہوتی اور بعض اوصاف جیسے عقلمندی وتوانائی جدا ہونے یا تبدیل ہونے کا امکان رکھتے ہیں لیکن ہر حال میں سب ماسواء ذات ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے الگ ہے۔

یہ مطلب (ذات کا صفات سے اور صفات کا دیگر چیزوں سے دوری رکھنے کی) بہترین دلیل ہے اس لئے کہ وہ ذات جو صفت رکھتی ہے اور وہ صفت جو کہ معرفت ذات ہے دونوں لامحدود اور لامتناہی ہیں اس لئے کہ اگر ذات غیر محدود اور لامتناہی ہوگی تو صفات کو بھی اپنے دامن میں لے لیگی اور اسی طرح صفات بھی ایک دوسرے پر محیط ہوجائیں گی نتیجتاً سب ایک ہوجاتے ہیں مثلاً انسان کی ذات اسی قوت وتوانائی سے فرض کی جائے گی، اسی طرح توانائی، عقلمندی، برتری، خوبصورتی یہ سب ایک دوسرے کے مطابق اور ان سب کے معنی ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں گے۔

ان تمام گذشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عزوجل کی ذات کے لئے صفت (گذشتہ معنوں میں) ثابت نہیں کی جاسکتی ہے اس لئے کہ صفت کی ایک حد ہے اور ذات مقدس تعالیٰ ہر حد سے منزہ ہے۔

خداوندی صفات کے معنی:

ہم تخلیق کائنات میں بہت زیادہ کمالات دیکھتے ہیں جو کہ صفات کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں یہ تمام صفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ جس جگہ ظاہر ہوتے ہیں اپنے وجود کی قدر وقیمت سے اسے کامل بنادیتے ہیں جیسا کہ ایک زندہ اور موجود انسان اور ایک موجود

بے روح پتھر کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

بے شک ان کمالات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ خود ان کمالات کا حامل نہ ہوتا تو وہ نہ یہ کمالات کسی دوسرے کو بخش سکتا تھا اور نہ ہی مکمل کرسکتا تھا۔ اس لئے عقل سلیم یہ کہنے پر مجبور ہے کہ خداوند عالم جو خالق کائنات ہے وہ علم اورقدرت رکھتا ہے وہ علم وقدرت اورہر کمال کا حامل ہے۔

لیکن اس نکتہ کوملحوظ رکھتے ہوئے کہ خداوند عالم کی ذات لامحدود اور لامتناہی ہے یہ کمالات جو کہ صفات کی صورت میں ثابت ہوتے ہیں، درحقیقت عین ذات اسی طرح ایک دوسرے کےعین مطابق ہی ہیں اور وہ جدائی جو ذات وصفات اور خود صفات کے درمیان دکھائی دیتی ہے وہ صرف ذہنی مفہوم کی سطح پر ہے حقیقت کےلحاظ سےسواء ایک بسیط واحد کے قابل تقسیم نہیں ہے۔

اسلام اس بے بنیاد اورناروا اشتباہ سے گریز کے سلسلہ میں (اصل کمال کی توصیف یا نفی کے ذریعہ حد بندیاں) اپنے رہبروں کےعقیدہ کو اثبات ونفی کے درمیان محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہ حکم دیتا ہے کہ لوگ بس یہ اعتقاد رکھیں کہ خدا علم رکھتا ہے لیکن دوسروں کے علم جیسا نہیں وہ قادر مطلق ہے مگر دوسروں جیسی قدرت نہیں رکھتا ہے وہ سنتا ہے لیکن اس کے لئے وہ کان کا محتاج نہیں وہ دیکھتا ہے لیکن اسے آنکھوں کی ضرورت نہیں اسی طرح اس کی دوسری حقیقتیں ہیں۔

صفات کے معنی کے سلسلہ میں دیگر توضیحات:

صفات کی دو قسمیں ہیں صفات کامل، صفات ناقص۔ صفات کامل وہ صفات ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے وہ اثباتی مفاہیم ہیں کہ اپنے موضوعات وجود اور ان کے آثار کے زیادہ ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

ایک موجود اور زندہ دانا وعقلمند چیز کا دوسری مردہ اور بے علم وقدرت چیز کے تجزیہ و مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اورصفات ناقص بالکل اس کے برخلاف صفات کا نام ہے۔

جب ہم ناقص صفات کے سلسلہ میں دقت نظر سے غور وفکر کریں گے تو دیکھیں گے کہ معنی کے اعتبار سے ناقص صفات کمال کے فقدان اور کسی بھی وجود میں قدر وقیمت کے نہ پائے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے جہل ، عاجزی برائی صحت کا فقدان وغیرہ اور ان جیسی صورتیں۔

اس لحاظ سے جو کچھ گذرا کہ صفات کا ناقص نہ ہونا کامل صفات کے معنی دیتا ہے جیسے نادانی کا انکار دانائی کی علامت ہے اور ناتوانی کا انکار قوی ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اور اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل بیان ہے کہ قرآن کریم نے ہر کامل صفت کو خداوند عالم کے لئے ثابت قرار دیا ہے اور اس نے ہر ناقص صفت کی نفی کی ہے اور اس کے عکس کو خدا کے لیے ثابت قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وھو العلیم القدیر، وھو الحی ولاتاخذہ سنة ولانوم ، واعلموا انّکم غیر معجزی اللہ یعنی وہ علیم وقدیر ہے، حی (زندہ) ہے نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اور یاد رکھو تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔

ایک نکتہ جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم ایک مطلق حقیقت امر ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں۔ اس لحاظ سے ہر کامل صفت جو اپنے مقام کے لحاظ سے ثابت ہے وہ محدود ہونے کا معنی بھی نہیں رکھتی اسے دیت یا جسمانی لحاظ سے یا زمان ومکان کے حساب سے محدود نہیں کیا جاسکتا ہے اور وہ ہر ایسی موجودہ صفت سے منزہ ہے جو حادث ہو اور ہر وہ صفت جو کہ حقیقتاً اس کے لئے ثابت ہے وہ محدودیت اور تخلیہ کے معنی سے تعبیر کی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ''لیس کمثلہ شئی'' اس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔ سورہ شوریٰ آیت ۱۱

صفات فعل:

اوصاف کی (وہ چیزیں جو گذر چکی ہیں) اسکے علاوہ بھی دو قسمیں ہیں ایک صفات ذات دوسرے صفات فعل۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ کبھی صفت اپنے موصوف کی وجہ سے قائم رہتی ہے جیسے حیات

علم قدرت جو کہ باحیات عقلمند اور قوی انسان سے قائم ہے اور ہم انسان کو تنہا ان اوصاف سے متصف فرض کر سکتے ہیں اگر چہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز فرض نہ کریں اور کبھی صرف موصوف کے ساتھ قائم نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس صفت سے متصف نہیں ہوتا حق کا طلب کرنا یہ دوسری بات ہے جیسے لکھنا گفتگو کرنا، کسی کو چاہنا وغیرہ اس لئے کہ انسان کو اس وقت کاتب فرض کیا جاسکتا ہے۔جب اس کے لئے دوات قلم کاغذ جیسی چیزوں کو پہلے فرض کرلیا جائے اور اس وقت مغز سمجھا جاسکتا ہے جب اس کے لئے سننے والے فرض کئے جائیں اور اس وقت اسے کسی چیز کا طالب فرض کیا جاسکتا ہے جب وہ چیز فرض کرلی جائے اور صرف انسان کو فرض کرلینا ان تمام اوصاف کے تحقیق کے لئے کافی نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عالم کے حقیقی صفات جو عین ذات ہیں، تنہا پہلی قسم سے ہوں گے لیکن دوسری قسم جس کے حاصل کرنے میں کوئی دوسرا وسیلہ ضروری ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ اسکا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صفت جو اپنی پیدائش کے بعد وجود میں آتی ہے وہ خدائے متعال کی صفت ذات اور عین ذات نہیں ہوسکتی۔

وہ صفات جو خدائے متعال کے لئے تخلیق کائنات کے بعد ثابت ہوئے ہیں جیسے پیدا کرنے والا، پالنے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، روزی دینے والا اور اس طرح کے دوسرے اوصاف یہ عین ذات نہیں بلکہ یہ ذات سے بھی زیادہ ہیں اور یہ فعل کی صفت ہے۔ صفت فعل سے مراد یہ ہے کہ فعل کے صادر ہونے کے بعد صفت کا مفہوم فعل سے اخذ کیا گیا ہو نہ ذات سے جیسے پیدا کرنے والا جو کہ کائنات کی تخلیق اور مخلوقات کی خلقت سے ماخوذ ہے اور مخلوق کے ساتھ اسکی وابستگی ہے نہ خدا کی ذات کے ساتھ کہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ذات صفت کے ظاہر ہونے کے بعد ایک حال سے دوسرے حال میں بدلتی جائے۔

اہل تشیع دو صفت ارادہ اور کلام کو جس کے معنی ان الفاظ سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں (ارادہ کے معنی چاہنا اور کلام کے معنی سے لفظی انکشاف کے ہیں) اسے صفت فعل جانتے ہیں

جبکہ بزرگ اہل سنت اسے علم کے معنی میں تسلیم کرتے ہیں اور اسے صفت ذات میں شمار کرتے ہیں۔

قضاء وقدر:

اس جہان ہستی میں علیت کا قانون معتبر کسی استثناء کے حاکم اور اس قانون کے لحاظ سے اس دنیا کے تمام مظاہر اپنی پیدائش کے لحاظ سے کوئی علت یا سبب سے وابستہ ہیں ان میں کی تمام چیزوں کو فرض کرتے ہوئے (جسے کہ علت تامہ کہا جاسکتا ہے) اس کی پیدائش ضروری ہوجاتی ہے۔ اور اگر تمام چیزوں کا فقدان فرض کرلیا جائے یا ان تمام مظاہر کا پیدا ہونا مفروض معلول کے نتیجے میں ضروری ہے اور جبری اور اگر وہ اسباب نہ ہوں تو محال ہے۔

اس نظریے پر غور وفکر کرنے پر مندرجہ ذیل دو نظریے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اگر ایک مظہر خلقت کو اس کی تمام علت تامہ یا علت تامہ کے اجزا کے لحاظ سے دیکھیں تو اس کا تعلق علت تامہ سے جبری ہوگا اور علت تامہ کے اجزاء سے جن کو علت ناقصہ کہا جاتا ہے امکان کی حد تک ہے اس وجہ سے کہ جزوی علت معلول کے وجود کا امکان پیدا کرتی ہے نہ اس کو ضروری اور لازمی بناتی ہے۔

نظام خلقت جس کا ہر مظہر اپنی پیدائش کے لحاظ سے کسی علت تامہ سے وابستگی رکھتا ہے اس نظام ہستی میں ضروری اور لازمی ہونا حاکم ہے اور اس کا پیکر جو حوادث کے ایک لازمی سلسلہ سے تشکیل پایا ہے اس کے ساتھ ساتھ امکان کی صفت بھی اس کے ان اجزاء میں جس کی وابستگی علت تامہ سے نہیں ہے، پائی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں اسی ضرورت کے حکم کو قضاء الٰہی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اسی ضرورت نے جہان کے تشکیل دینے والے سے اپنا وجود حاصل کیا اور اسی وجہ سے حکم و قضا حتمی ہے جس سے گریز اختیار نہیں کیا جاسکتا یہ عادلانہ نظام جس میں استثناء اور خداوند عالم کا ارشاد ہے (والاله الخلق والامر) یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابعدار ہیں۔

سورہ اعراف آیت ۵۴ ۔ اور پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔(اذا قضاء امرا فانما یقول له کن فیکون) اور جب کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو اس کی نسبت صرف کہدیتا ہے کہ ہوجا بس وہ ہوجاتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۱۱۷) یا پھر یہ حکم کہ (واللہ یحکم لا معقب لحکمه) اور خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اسکے حکم کا کوئی ٹالنے والا نہیں۔ سورہ رعد آیت ۴۱)

۲۔ علت کے اجزاء میں سے ہر ایک اپنے معلول (اثر) کے لحاظ سے ایک اندازہ اور نمونہ فراہم کرتا ہے اور اثر کی پیدائش مجموعہ کے اندازہ کے مطابق وموافق ہے علت تامہ نے اسکے لئے معین کئے ہیں مثلاً وہ اسباب جو انسان کے دوران تنفس کے وجود کا ذریعہ ہیں وہ مطلقاً تنفس کو ایجاد نہیں کرتے بلکہ ایک اندازہ کے مطابق ایک معین وقت اور شکل میں مجرائے تنفس سے نسیج کو پھیپھڑوں تک پہنچاتے ہیں اور وہ اسباب جو انسان کے دیکھنے کا ذریعہ بنے (اور انسان بھی اس کا جز نہیں) قوت بصارت بغیر قیدوبند کے یقین حاصل نہیں کرلیتی بلکہ بصارت جس کے وسیلوں کے ذریعہ سے ہر جہت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے اسے ایجاد کرتی ہے حقیقت تمام فطرت جہاں اور حوادثات میں جو متفق علیہ ہیں بغیر کسی اختلاف کے جاری ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو قدر کے نام سے یاد کیا ہے اور خداوند عالم جو کہ سرچشمہ تخلیقات ہے اس کی طرف نسبت دی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے(انا کل شئی خلقنا بقدر") بے شک ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز سے پیدا کی ہے سورہ قمر ۴۹ اور پھر ارشاد ہوتا ہے (وان من شئی الاعندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم) اور ہمارے یہاں تو ہر چیز کے بے شمار خزانے (بھرے) پڑے ہیں اور ہم اس میں سے ایک نپی تلی مقدار بھیجتے رہتے ہیں۔ سورہ حجر آیت ۲۱

چنانچہ قضاء الٰہی کے مطابق ہر مظہر قدرت اور ہر وہ حادثہ جو کہ نظام تخلیقات میں اپنا مقام رکھتا ہے واجب الوجود اور غیر قابل اجتناب ہے۔ اسی طرح قدر کے لحاظ سے ہر مظہر قدرت یا حادثہ جو وجود میں آتا ہے ایک اندازہ کے مطابق جو خدا کی طرف سے معین ہے ہرگز

کمتر اور کسی سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

انسان اور اختیار:

ہر وہ کام جسے انسان انجام دیتا ہے وہ دنیا کی تخلیقات کا مظہر ہیں اور ان کی پیدائش تمام مظاہر خلقت کی طرح کسی علت سے وابستگی رکھتی ہے۔اور اس طرح متوجہ ہوتے ہوئے کہ انسان پیداشدہ دنیا کا جز ہے اور کائنات کے دوسرے اجزا سے وجودی ارتباط رکھتا ہے دوسرے اجزاء کو اس کے فعل میں بے اثر نہیں قرار دیا جاسکتا۔مثلاً روٹی کا ایک لقمہ جو انسان کھاتا ہے تو اس فعل کی انجام دہی کے لئے جیسا کہ ہاتھ پیر کام ودہن ،علم وقدرت اور ارادہ جیسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح روٹی کا ہونا اس کا دسترس میں ہونا اور اس کے حصول سے کوئی مانع نہ ہونا اور اس طرح کی دوسری زمانی ومکانی شرطیں اس عمل کی انجام دہی کے لئے لازم ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مجموعہ اجزاء علت تامہ کی نسبت سے کسی فعل کا ضروری اور لازمی ہونا اس بات سے منافات نہیں رکھتا کہ انسان کی نسبت اس فعل سے جو علت تامہ کا ایک جز ہے وہ امکان کی حد تک ہو۔

انسان کا صاف وشفاف اور سادہ ادراک اس نظریے کی تائید کرتا ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے امور مثلاً کھانا پینا آنا جانا ،صحت ومرض بزرگی اور بلند قامتی میں فرق کرتا ہے اور پہلی قسم کو جس کا تعلق انسان کے ارادہ اور خواہش سے ہے وہ اس کو انسان کی اختیار میں سمجھتے ہیں اور اسے امر ونہی کا مقام اور مقام تعریف وتنقید قرار دیتے ہیں ۔ برخلاف دوسری قسم کے جس میں انسان کو مکلف نہیں سمجھا جاتا۔

صدر اسلام میں اہل سنت کے درمیان خاص طور پر انسانی افعال کے سلسلہ سے دو مشہور مذہب تھے ایک گروہ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کے افعال خداوند کے غیر قابل تغیر وارادہ سے متعلق ہیں اس وجہ سے انسان مجبور محض ہے اور انسان کے ارادہ واختیار کی کوئی قیمت تسلیم نہیں کرتے اور ایک گروہ انسان کو اپنے فعل میں مستقل جانتا ہے اور خدائی ارادہ سے اس کا

تعلق نہیں سمجھتا۔

لیکن تعلیمات اہلبیت جو کہ تعلیمات قرآن کے ظاہر سے مطابقت رکھتی ہے اس کے مطابق انسان اپنے فعل میں مختار ہے لیکن کاملاً آزاد نہیں بلکہ خداوند عالم نے اختیار کے راستے سے فعل کو انجام پانے کا طریقہ معین کیا ہے اور ہماری سابقہ تعبیر کے مطابق خداوند متعال نے مجموعہ اجزاء علت تامہ کے ذریعہ کہ ان میں سے ایک انسان کا ارادہ واختیار ہے فعل کو انجام پانے کا راستہ مقرر کیا ہے اور نتیجتاً اس طرح کی خدائی مشیت کے نتیجہ میں انسان ضروری افعال کے سلسلہ میں بھی مختار ہے یعنی فعل اجزاء علت کے مجموعہ کی نسبت سے ضروری اور اس کے اجزاء کی نسبت جز سے جو کہ انسان اختیاری اور ممکن ہے۔

چھٹے امامؑ فرماتے ہیں نہ جبر ہے اور نہ واگذاری بلکہ یہ دو حکم کے درمیان ایک حکم ہے۔(بحار ج ۳ ص ۵)